۱۵/اپریل ۱۹۷۲ء

رجسٹرڈ نمبر L. 922

فون نمبر 29

ہفتہ وار

ہماری زبان

ایڈیٹر

آل احمد سرور

قیمت سالانہ چھ روپے

فی کاپی بیس پیسے

اشاعت کی تاریخیں

۱، ۸، ۱۵، ۲۲

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۱۵

اداریہ

پاکستان میں اردو کا مستقبل

ادھر پاکستان سے جو خبریں آرہی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اردو کے لئے خاصے خطرے پیدا ہوگئے ہیں۔ اوّل اوّل پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو تھی۔ اس کے بعد جب بنگالیوں نے اس پر سخت احتجاج کیا اور بہت سے مظاہرے ہوئے اور بہت سے بنگالیوں نے اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دی تو پاکستان میں اردو اور بنگالی کو برابر کا درجہ دیا گیا۔ مگر عملی دنیا میں بنگالیوں کو اور بنگالی کو وہ حقوق نہیں ملے جو اکثریت اور اکثریت کی زبان کو ملنے چاہئیں تھے۔ اس لئے وہاں علاقائی خود مختاری کی تحریک شروع ہوئی جس کو جب تشدد کے ذریعہ سے کچلا گیا تو بالآخر بنگلہ دیش آزاد ہوگیا۔ اس کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستان میں اردو کی سرکاری زبان کی حیثیت پر کوئی آنچ نہ آتی مگر موجودہ دور میں جمہوری تصورات کے ساتھ علاقائی پاسداری کا جو رجحان ترقی کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہر علاقے کی زبان اور تہذیب اور ادب اور مقامی خصوصیات پر جس طرح توجہ بڑھتی ہے، اس کی وجہ سے قدرتی طور پر پنجاب میں پنجابی۔ سرحد میں پشتو۔ سندھ میں سندھی اور بلوچستان میں بلوچی کی ترقی پر زور دیا جانے لگا اور ان سب کو قومی زبانوں کی حیثیت دینے کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ پنجاب دراصل ایک دو زبانی صوبہ ہے وہاں بول چال کی زبان پنجابی ہے مگر سب پڑھے لکھے اردو جانتے اور اردو لکھتے ہیں پنجابی اور اردو دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب بھی ہیں۔ سو برس سے زیادہ ہوئے کہ لاہور اردو کا ایک اہم مرکز بنا اور آج بھی وہ ایک بڑا مرکز ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان سے جو لوگ پاکستان گئے وہ قریب قریب سبھی اردو بولنے والے تھے۔ انھوں نے زیادہ تر سندھ اور سندھ میں بھی کراچی کا رخ کیا، مگر خاصی تعداد پنجاب بھی گئی۔ آج صورت حال یہ ہے کہ سندھ پر اردو کا اقتدار سندھیوں کو گوارا نہیں اور وہ سندھی کو اپنے علاقے کی سرکاری زبان بنانا چاہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہاں سے جانے والے اردو بولنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ انھوں نے پاکستان بنوایا ہے اور سندھی اس حد تک ترقی یافتہ نہیں جتنی اردو ہے، سندھی کی بڑھتی ہوئی تحریک کے ساتھ بڑی حقارت کا سلوک کیا، مگر اب انھیں یہ اندازہ ہورہا ہے کہ سندھ میں رہ کر سندھی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ دن بھی دور نہیں جب انھیں اپنے بچوں کو سندھی بھی سکھانی پڑے گی۔ اگر جیسا کہ قرینہ معلوم ہوتا ہے، رفتہ رفتہ پنجاب میں پنجابی، سرحد میں پشتو، سندھ میں سندھی اور بلوچستان میں بلوچی اپنے اپنے علاقوں کی سرکاری زبانیں قرار دے دی گئیں تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اردو کا پاکستان میں کیا حشر ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی موجودہ حیثیت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس صورت حال کے وجوہ کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے اس پر ماتم کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔

اردو پاکستان کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہے۔

پنجاب میں ضرور اسے ایک خاص پوزیشن حاصل ہے کیونکہ وہاں لوگ پنجابی بولتے ہیں اور اردو لکھتے پڑھتے ہیں مگر بالآخر پنجابی کی تحریک وہاں زور پکڑے گی اور اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ پاکستان کی دوسری ریاستوں میں اردو بولنے والے اقلیت میں ہوں گے اور اردو ایک اقلیتی زبان کی حیثیت سے وہاں زندہ رہے گی۔ مسٹر بھٹو کی کرتب بازی کے باوجود نظر یہ آتا ہے کہ پاکستان میں ایک ایسا وفاقی نظام قائم ہوگا جس میں چاروں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری ملے گی اور مرکز بچاؤ، امور خارجہ اور مالیات کا ہی ذمہ دار ہوگا۔ ایسی صورت میں ان چاروں علاقوں کے رابطے کی زبان اردو ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ علاقائی زبانوں کی حریف نہ ہو بلکہ حلیف ہو۔ اگر اردو چونکہ کسی علاقے کی اکثریت کی زبان نہیں ہے اور جمہوری طرز فکر اور جمہوری اقدار کی مقبولیت کے دور میں اکثریت کے جذبات وخیالات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس لئے پاکستان میں اردو کا مستقبل اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے جب وہ وہاں کی علاقائی زبانوں سے اثر قبول کرے اور ان پر اثر ڈالے اور ان کی اصل پوزیشن کو کسی طرح چیلنج نہ کرے، جو جمہوری نظام انھیں دیتا ہے۔ پاکستان کی چار زبانیں اگر اپنے اپنے علاقے میں اپنے پورے قد کو پہنچ جائیں اور اردو والے ماضی کی منطق کو بھول کر حال کے ساتھ سمجھوتہ کریں تو اس کا امکان باقی ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والے اردو کو رابطے کی ایک زبان کے طور پر تسلیم کرلیں۔ جمہوریت کے معنی اکثریت کی آمریت کے نہیں ہیں، مگر جمہوریت میں اقلیت، اکثریت کے جذبات وخیالات کو سمجھ کر اور اسے اپنے ساتھ لے کر ہی اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنا سکتی ہے۔ پاکستان کے اردو دوستوں کو حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔

مضطر ہاشمی کا انتقال

نئی دہلی: معلوم ہوا ہے کہ اردو کے اخبار نویس اور ادیب مضطر ہاشمی کا دہلی میں ۵۷ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

وہ متعدد مقبول ناولوں کے مصنف تھے ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان سے ہندوستان چلے آئے تھے ان کے پسماندگان میں بیوی اور دس لڑکے لڑکیاں شامل ہیں۔ • قومی آواز۔ لکھنؤ

مطالعہ غالب کے نئے امکانات

اردو میں "غالب اور آہنگ غالب" اور "نقش غالب" کے بعد غالب اکیڈمی نئی دہلی کی تیسری پیش کش "غالب اور ذکا" کے نام سے عالمی کتابوں کے میلہ کے موقع پر اور انیسویں آل انڈیا لائبریری کانفرنس کے انعقاد کے دوران اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ منظر عام پر آگئی ہے۔

"تاریخ، ادب اور اسلامیات میں ضیاء الدین احمد شکیب کے نئے تحقیق اور انتقادی زاویوں نے اہل نظر کو چونکا دیا ہے۔ ان کی یہ تالیف "غالب اور ذکا" میرزا غالب کی زندگی کے آخری دس برسوں کی بعض کھوئی ہوئی کڑیوں کی بازیافت کرتی ہے جس میں غالب اور محمد حبیب اللہ ذکا خیوری کی کئی نادر تحریروں کا انکشاف کیا گیا ہے اور ذکا کی نظم ونثر پر میرزا غالب کی کم وبیش ستر اصلاحیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ماحول، تاریخی پس منظر، روابط اور تعلقات کے تجزیے کی روشنی میں مطالعہ غالب کے نئے مناہج وامکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔ یقین ہے کہ غالب شناس اس کتاب کی پوری قدر کریں گے۔

قیمت چھ روپے۔ صفحات ۱۲۸، سائز ۱۸×۲۲/۸ مجلد ملنے کا پتہ غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی ۱۳۔

وزیر آفریدی کی کتاب "شخصیتیں"

رامپور: مشہور ادیب وشاعر وزیر آفریدی کی نئی کتاب "شخصیتیں" مئی ۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں اس عہد کے بارہ اہم اور معروف ادیبوں اور شاعروں کی زندگی، شخصیت اور ادبی کام پر ایک جامع اسکیچ ہے۔ صفحات ۱۲۰، قیمت مجلد تین روپے ہے۔ ملنے کا پتہ وزیر آفریدی اردو ریسرچ اکاڈمی، گھیر عثمان خاں، رامپور یو۔پی۔

اردو کے ایک صاحب فراش ادیب کو اردو اکاڈمی کی امداد

اردو اکاڈمی اتر پردیش نے اردو کے مشہور ومعروف ادیب وشاعر جناب حامد اللہ افسر کو بحالت بیماری علاج ومعالجہ کے لئے ۵۰۰ روپیہ بطور امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

جناب حامد اللہ افسر نے جو ایک عرصہ سے بیمار اور صاحب فراش ہیں حال ہی میں اکاڈمی سے مالی امداد کی درخواست کی تھی۔ پبلسٹی سپرلیڈ

اظہر افسر کی نئی تصنیف پر ادبی انعام

حیدرآباد: ادارہ اشاعت وترویج اردو کمیٹی نے اس سال ممتاز ڈرامہ نگار جناب اظہر افسر کے ڈراموں کے مجموعے "بھول ہی بھول" کو انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ ڈراموں کا یہ مجموعہ نسیم بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

• نامہ نگار

ڈاکٹر عبدالودود

شبلی کی تنقید

شبلی کے علمی کارناموں میں تنقید نگاری بھی شامل ہے۔ شعرالعجم اور موازنۂ انیس و دبیر ان کا ایک بڑا کارنامہ ہیں۔ انھیں تاثراتی اور جمالیاتی نقاد کہا جاتا ہے۔ ان کی تنقید اور حالی کی تنقید کا موازنہ کرکے دونوں کی انفرادیت نمایاں کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شبلی کا تنقیدی تجزیہ حالی سے کچھ مختلف ضرور ہے لیکن اتنا مختلف بھی نہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے کا حریف اور دونوں کو تنقید کے دو مختلف دبستانوں کا بانی سمجھ لیا جائے۔

شبلی کو تاثراتی اور جمالیاتی نقاد کہنا درست نہیں۔ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کے بڑے نقاد مہدی افادی ہیں لیکن ان سے بھی پہلے میر ناصر علی ادب کے اس میدان میں اپنے آثار چھوڑ گئے ہیں۔ اردو میں تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے میر ناصر علی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے تنقیدی مضامین نہیں لکھے۔ تنقید پر ان کی تصانیف نہیں ہیں لیکن انھوں نے اپنے رسائل، تیرھویں صدی اور صلائے عام کے ذریعہ ایک نئے ادبی شعور کو فروغ دیا جو ہم عصر ادبی تحریک کا حریف بن گیا۔ یہ نیا رجحان نثر نگاروں میں زیادہ مقبول ہوا اور اردو نثر، ایک طرف نثر اور دوسری طرف شاعری کا حق ادا کرنے لگی۔ میر ناصر علی کی مستقل تنقیدی تصانیف و مضامین نہ سہی لیکن انھوں نے ان رسائل کے مختصر اداریوں اور تحریروں کے ذریعہ نئی نسل کو متاثر کیا اس سے ایک نیا شعور فروغ پذیر ہوا۔ ادبی تنقید میں حالی کے حریف شبلی نہیں میر ناصر علی تھے۔

شبلی کو تاثراتی اور جمالیاتی نقاد اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ شعر میں تاثر کے قائل ہیں اور جمالیاتی پہلو کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ شاعرانہ مصوری اور محاکات کے دلدادہ ہیں۔ محاکات تخیل، الفاظ کے فنکارانہ استعمال اور شاعرانہ صناعی پر انھوں نے جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس وجہ سے انھیں اردو تنقید کے جمالیاتی دبستان کا بانی مان لیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان خوبیوں پر زور دینے سے ہی جمالیاتی تنقید وجود میں آجاتی ہے اور شعر میں ان خوبیوں کا متلاشی نقاد جمالیاتی نقاد کہا جائے گا۔

شبلی کی شاعری اچھی خاصی بامقصد شاعری ہے۔ ان کی شاعری اور تنقید دو خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتیں۔ شبلی جیسا ادیب یہ غلطی نہیں کرسکتا کہ وہ شاعری کی خصوصیات ولوازمات کچھ اور بیان کرے اور جب خود شاعری کرے تو اپنے ہی تنقیدی نظریات ایک طرف رکھ دے۔ شبلی ایک قومی شاعر کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک جمالیاتی نقاد کے نزدیک ایسی شاعری مستحسن نہیں کیوں کہ قومی شاعری بامقصد ہوتی ہے اور اس میں خطیبانہ لب ولہجہ بھی آجاتا ہے۔ شعرالعجم، جلد چہارم کے ابتدائی چند صفحات دیکھ کر ہی عموماً اکتفا کیا گیا ہے اور یہ جتایا گیا ہے کہ شبلی کا نقطۂ نظر شعر و ادب کیا تھا وہ تنقید کے کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ غلطی ہماری ہی ہے شبلی کی نہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ شبلی کو ہی اس کا ذمہ دار قرار دیں اور ثبوت میں شبلی کے یہ اقوال پیش کریں۔

"اصلی شاعر وہی ہے، جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے کلام سے یہ تعلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔"

"شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے، جو کچھ کہتا ہے، اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔"

"شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔"

"اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہوسکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔"

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ شبلی کے تنقیدی نظریات غیر واضح ہیں لیکن اتنے مبہم بھی نہیں کہ انھیں نہ سمجھا جاسکے۔ اگر ان کی تنقید کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر بھی نظر رکھی جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ "اصل شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو" ان کا یہ بھی قول ہے کہ "شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے" "دوسروں کے جذبات" "کو ابھارتا ہے" "تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے" "شعرالعجم" کے ان جملوں سے عموماً اس نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے کہ شبلی کے نزدیک شاعری، شاعر کے احساسات و جذبات کا اظہار ہوتی ہے۔

شبلی کی تنقید میں سب سے زیادہ الجھن لفظ خطابت پیدا کرتا ہے۔ وجہ، شاعری کے آغاز سے ترقی پسند شاعری تک

خطیبانہ لب ولہجہ ہی چھایا رہا۔ ملّی، قومی اور سیاسی شاعری میں خطابت کے انداز کا آجانا، ناممکن نہیں ہے لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ ایسے غزل گو اور نظم گو بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے قومی اور انقلابی شاعری کا حق بھی ادا کر دیا اور خطیبانہ انداز سے بھی اپنا دامن بچائے رکھا۔

لیکن شبلی نے خطیب کا لفظ 'مقرر' یا مخاطب کرنے والے کے مفہوم میں استعمال ہی نہیں کیا۔ وہ واعظانہ اور ناصحانہ انداز میں مخاطبت کو خطابت کہتے ہیں۔ وہ روکھے پھیکے، بے کیف اور شعریت سے عاری لب ولہجہ سے مطمئن نہ تھے۔ انھوں نے جس قسم کے شاعر کو خطیب کہا ہے وہ ان کے دور کا ایسا ہی شاعر ہے جو شاعر کم اور مصلح زیادہ ہے۔ اس مفہوم سے قطع نظر اگر خطابت کا حقیقی مفہوم پیش نظر رکھیں تو شبلی سے بڑا خطیب دوسرا کوئی شاعر ان کے ہم عصروں میں نظر نہیں آتا۔ جذبہ کی شدت اور جوش وخروش جس قدر شبلی کے یہاں ہے ان کے دور کے دوسرے شاعروں کے یہاں نہیں ہے۔

شاعر وخطیب کی تفریق تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کی اصطلاحات پر ہی اگر ہم نظر مرکوز رکھیں تو شبلی نئے ادب کے ہم نواؤں سے بہت زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعر دوسروں کے جذبات واحساسات کا نباض نہیں ہو سکتا۔ شبلی اور ان کے ہم عصر شعراء تو سب سے زیادہ نبض شناس نظر آتے ہیں۔

شبلی کے یہاں مربوط تنقیدی نقطۂ نظر، نظر نہیں آتا۔ نظریات کا تضاد بری طرح کھٹکتا ہے۔ ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ شاعری "تنہا نشینی" اور "مطالعۂ نفس" کا نتیجہ ہے اور دوسری طرف ان شاعروں کے بھی مداح ہیں جنھوں نے دوسروں کے جذبات کو ابھارا بھی ہے۔ وہ پرجوش اور جذبات برانگیختہ کرنے والی شاعری کے ہمیشہ مداح رہے ہیں۔ عرب شعراء کے پرجوش اور ولولہ انگیز قصیدوں کی انھوں نے بڑی تعریف کی ہے۔ عمرو کلثوم کے ایک مشہور قصیدے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "آج بھی یہ اشعار دلوں کو گرما دیتے ہیں۔" اس طرح شبلی دلوں کو گرما دینے والی شاعری کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ فارسی شاعری کے مقابلے میں عربی شاعری کی اثر انگیزی انھیں متاثر کرتی ہے۔ عمرو کلثوم کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اور ایران کے شاعروں کے رویہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

"یہ شاعری کا صحیح استعمال تھا اور اسی کا اثر تھا کہ عرب میں قوم کی باگ ڈور شعراء کے ہاتھ میں تھی۔ وہ قوم کو جدھر چاہتے تھے جھونک دیتے تھے اور جدھر چاہتے تھے روک لیتے تھے۔ افسوس ہے کہ ایران نے کبھی یہ خواب نہیں دیکھا۔"

انھوں نے رجزیہ شاعری کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے:

"میدان جنگ میں جنگی باجے وہ کام نہیں دے سکتے جو رجز کا ایک مصرعہ دے سکتا ہے۔"

ایک طرف تو وہ یہ لکھتے ہیں کہ "اصلی شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو" لیکن دوسری جگہ شاعری کو شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔

"اگر شاعری کے ذریعہ اخلاقی مضامین بیان کیے جائیں اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت، ہمت، عزت، حمیت، آزادی کو اشعار کے ذریعہ ابھارا جائے تو کوئی اور طریقہ اس کی برابری نہیں کر سکتا۔"

شبلی دیدہ ور مورخ اور محقق ضرور ہیں لیکن تنقید میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ وہ حالی کے مرتبہ کے نقاد نہیں ہیں۔ ان کے کچھ جملے متاثر ضرور کرتے ہیں اور اس کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ شبلی محاسن شعری کو نظر انداز نہیں کرتے لیکن جب وہ عملی تنقید کرتے ہیں تو اپنے ہی نظریات کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ حالی کا ذہن زیادہ صاف، ان کے نظریات زیادہ واضح اور غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔

شبلی کی تنقید جیسی بھی ہے، ان کی شخصیت کا ہی پرتو ہے۔ ان کی شخصیت میں جدیدیت، ترقی پسندیت اور قدامت کے رنگ ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اسے نیرنگی کہہ لیجیے لیکن یہ نیرنگی حسن نہ بن سکی۔ شخصیت میں یہ رنگا رنگی دلکش ہو سکتی ہے لیکن تنقید میں عیب بن جاتی ہے۔ افسوس کہ یہ رنگ مل کر ایک رنگ نہ بن سکے۔

صفحہ ۲ سے آگے

۱۹۴۱ء میں ٹیگور کی وفات پر کہتے ہیں ؎

اے بلبل گلشن معانی		اے طائر شاخ نکتہ دانی!!
رفتی وگذاشتی ہمہ را		چشم پرنم حباب آسا

نادر خاں والی کابل کی شہادت پہ کہتے ہیں ؎

شہادت یافت نادر خاں بحکم حضرت یزداں
ثنا خواں روح پاک شاہ مرداں شد بجانبازی
باحقر از پئے تاریخ سال جانگزا اے او
سروشے گفت از عرش بریں آہ قتل شد غازی

۱۹۳۳ء

شمس تبریز خاں

رادھے شیام اختر کا کلام

پروفیسر مسعود حسن رضوی اختر صاحب کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"جناب رادھے شیام صاحب رستوگی اختر کا مولد و مسکن لکھنؤ ہے ان کے آباء و اجداد کا وطن بھی مدت دراز سے یہی مردم خیز شہر ہے۔ ان کے والد لالہ رگھوبر دیال صاحب ایک متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ ...... ان کو علمی شوق بھی تھا اور اردو فارسی میں اچھی استعداد اور ان زبانوں کی شاعری سے دلچسپی بھی اس طرح فارسی اور اردو شاعری کا ذوق اختر صاحب کو وراثت میں ملا ہے۔ رادھے شیام صاحب ۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے ۱۹۱۶ء میں چرچ مشن ہائی اسکول میں چھٹے درجہ میں داخل ہو گئے یہاں جناب ایم۔ سی۔ رائے ہیڈ ماسٹر اور منشی اودھ بہاری لال تمر فارسی کے معلم تھے وہ انگریزی گرامر کی تعلیم میں لاجواب تھے اور یہ فارسی کی تدریس میں بے نظیر رادھے شیام بھی ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے ...... ان کی تعلیم و تربیت نے فارسی ادب کا شوق مستحکم اور شعر و سخن کا ذوق پختہ کر دیا۔ اب وہ شعر کہنے اور منشی صاحب سے اصلاح لینے لگے انٹر اور بی۔ اے میں فارسی کو اختیاری مضامین شامل رکھا۔ ۲۷ء میں ایم۔ اے پاس کر کے لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے اور ۳۵ء سے اس عہدے پر مستقل ہو گئے۔ رادھے شیام صاحب اچھے مقرر ہیں، ۱۹۴۴ء میں جب وہ یو۔ پی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تو ان کی تقریر کے جوہر خوب کھلے اور مقرر کی حیثیت سے ان کو کافی شہرت حاصل ہوئی ۱۹۲۰ء سے دس سال تک صرف غزل ہی کہتے رہے ۱۹۳۰ء سے قومی آزادی کی تحریک سے متاثر ہو کر نظمیں کہنے لگے۔" (بالاختصار)

پروفیسر آل احمد سرور ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یوں تو ان کی شاعری روایتی شاعری ہے مگر محض روایتی شاعری کہہ کر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کے یہاں روایات کا اچھا احساس اور فن کا ایک گہرا تصور ملتا ہے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شاعری رستوگی صاحب کی شخصیت کا ایک ہی پہلو ہے یہ ان کی پوری زندگی نہیں۔ شاعرانہ جذبات کے سیلاب نے یہاں پوری شخصیت کو زیر و زبر کرنے کے بجائے ایک مخصوص وادی میں بسنا گوارا کر لیا ہے۔ رستوگی صاحب کی غزل میں پرانا رنگ ہے یہ رنگ کی خوبی یا خامی کی طرف نہیں اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے ......

غرض رستوگی صاحب کے اس "نقشہائے رنگ رنگ" میں کتنے ہی نقش اپنے حسن و زیبائش کی وجہ سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اس میں سندی ہے بھی ہے اور نچی بھی ہے۔ ان کی فارسی غزلوں میں بھی جا بجا خوش آب موتی بکھرے ہوئے ہیں اور اہل نظر کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔"

اختر صاحب کا مجموعۂ کلام "نقش ہائے رنگ رنگ" جب نظر سے گزرا تو اس پر کچھ لکھنے کی خواہش ہوئی کیونکہ یہ نقش بڑا دلکش تھا ان کے ہاں اساتذۂ لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی اچھی روایات کا بڑا اچھا نمونہ ملتا ہے۔ زبان کے لحاظ سے ان کے کلام میں آتش و ناسخ کے گہرے مطالعہ کا اثر جھلکتا ہے۔ خیالات میں بڑی صفائی، اعتدال اور توازن نظر آتا ہے اور ان کا مزاج غزل کے رنگ سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ان کا دیوان مختصر ہے مگر "قیمت بہتر" کا مصداق ہے جیسا کہ سرور صاحب نے لکھا ہے کہ شاعری اختر صاحب کی پوری زندگی نہیں بلکہ زندگی کا ایک حصہ ہے مگر یہ ایسا نہاں خانہ ہے جس سے زندگی کی مختلف شاہراہوں کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے اور انسانی جذبات کے گوناگوں پہلوؤں کو نظر کی گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔

پُرگو شاعروں کے مقابلہ میں کم گو شاعروں میں یہ خاص بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ان کا کلام بہت آراستہ، منتخب اور نک سک سے درست ہوتا ہے اور چونکہ خاص احوال و کیفیات اور دلی جذبات و تاثرات کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے اپنے اندر بڑی دلکشی، دل آسائی اور تاثیر رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا کلام محض جذبہ کی ترنگ اور امنگ نہیں بلکہ ذوق و مزاج کا حقیقی رنگ ہے۔ اختر صاحب کی اردو فارسی غزلوں میں فنی پختگی کے ساتھ حسن و جمال کا ایک پاکیزہ احساس، جذبات کی کامیاب عکاسی اور قلبی واردات کی خوش تصویر کشی کی گئی ہے۔ کلاسیکل رنگ کی ایسی چھاپ ہے کہ ان کے کلام میں اساتذۂ فن کی صلابت اور پختگی اور خیالات کی وضاحت و پختگی محسوس ہوتی ہے۔ ہم یہاں ان کی غزلوں سے ایک انتخاب پیش کرتے ہیں۔

نام سے تیرے جو روشن عطیۂ دیواں ہوا — ہر ورق خورشید کے مانند نور افشاں ہوا
دیوانہ ہوں کس شوخ کی میں جلوہ گری کا — دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سایہ ہے پری کا
پیدا کیا نہ دل نے تعلق کسی کے ساتھ — شادی نہ دل کی نہ غم ہجراں کا غم ہوا
گر جائے جو خورشید قیامت کے جلیں گے — یاد آئے گا یہ سایۂ دیوار تمہارا
مضموں لکھے ہیں اس رخ تاباں کے وصف کا — خورشید اک ورق ہے ہماری کتاب کا
اختر صبا نہ چھو سکی جس کی گرد کو — دامن کو اس کے ہاتھ لگاؤں میں کس طرح

ہمارے خوں کی رنگت شوخ ہے رنگ رخ گل سے
تماشا سے چمن دکھلائے گی قاتل کے دامن پر

خاطر نازک کہاں یہ غم کہاں — شیشہ کو پتھر سے ٹکراتے ہیں ہم

باتوں میں سحر، چال میں محشر، نگہ میں قہر
ثابت ہے ان سے نقشۂ دوراں تمہیں تو ہو

آگے تمہارے سرو ہے غیرت سے پا بگل
صحن چمن میں سرو خراماں نہیں تو ہو

ہیں حسرت دیدار سے بھی جان آنکھوں میں
ترے بیمار کی اللہ نے آسان مشکل کی!

اس میں ذکر یار ہے اس میں خیال یار ہے
اپنی خاموشی بھی ہم پہ ہے گویائی کے ساتھ

برہم نہ کر تو سلسلۂ زلف اے صبا
وابستہ دل ہیں اس میں ہر اک پیچ و خم کے ساتھ

شکوۂ ہجراں ہیں کیا کر دل
خوگر وہ اپنا دل ہے نشاط و وام کے ساتھ

ہم سے دیوانوں کو ایذا بھی ہے راحت کا
بیر جو آئے جنوں برہنہ پا ہوتی ہے

خدا کو دل میں ہم دیکھیں گے گو وہ طور کے بدلے
اسے قربت میں ڈھونڈیں گے مقام دور کے بدلے

تعلق روح کا لاہوت سے ہے
یہ قطرہ جزو بحر بیکراں ہے

ہوتے کسی بندش میں نہیں اہل صفا بند
کوزہ میں نہ دریا ہو نہ مٹی میں ہوا بند

پیش خالت عنبر بیان اندارو ہیچ قدر
نسبت از زلفت نباشد نافہ تاتار را

پائے در گل شد صنوبر از قد رعنائے تو
سرو در چشت ندارد طاقت رفتار را

فصل گل آمد واندست جنوں
میکنم چاک جیب و دامن خویشتن

چو ہوش گفتمش از مہر گفتا
مرا خورشید باشد حلقہ در گوش

رو گرفتم دگر از مہر بتاں اے اختر
تا مگر پیش خدا سر بگریباں زدم

بیا در خانۂ چشمم کہ از بہر نثار تو
نظر گوید کہ در بار دست جیب آستین کن

گہے کافر بیاد زلف و دوشش گہہ مسلمانم
زند شیخ و برہمن خندہ بر آئین و دین من!

یہاں تک تو غزل کے نمونے تھے۔ اختر نے اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں ان میں معاشرتی خرابیوں پر روشنی ڈالی اور اس کے مختلف شعبوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں "شاعروں سے شکوہ" میں انھوں نے جدید شاعری کی سہولت پسندی اور آزادہ روی پر گرفت کی ہے اور کہا ہے ؎

نہ ان کی ولگدازی ہے نہ ان کی لالہ کاری ہے
یہ کیسی پیروی حالی و آزاد کرتے ہیں

عدالتوں کے موجودہ نظام پر انھوں نے بھرپور تنقید کی ہے جو رشوت ستانی کا اڈا بن گئی ہیں اور جن کی وجہ سے انصاف عنقا ہوگیا ہے ؎

حاکم وقت نہیں پیرو مسلک عدل
خضر ہر گز یہ نہیں غول بیاباں کہیے
نور کو اس کے سمجھیے نار دو زخ!
اس کے برقاب کو بھی آتش سوزاں کہیے
جبکہ مجروح کے ہوں زخم بیاں داس داد
کیوں نہ مرہم کے عوض اس کو نمکداں کہیے
اس کے میدان و احاطہ کو سمجھیے دوزخ
اور اسے کعبۂ ایمان فروشاں کہیے

ایک بڑی موثر نظم انھوں نے برادری میں نفاق کے دور ان ہونے پر لکھی ہے جس میں اس کے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف بھی انھوں نے قلم اٹھایا اور لکھا ہے ؎

حق سے جنھوں کو ملائک پہ فضیلت کیسی
بنے اعمال سے اپنے ہوئی ذلت کیسی

ایک ہی نسل سے آدم کے ہیں پیدا دونوں
پھر دہی ہم میں دہی (؟) تم ہو عداوت کیسی

دو رہے (؟) زر کھتے ہو ناپاک کتابوں سے مدام
حق تعالیٰ کی امانت میں خیانت کیسی

کسی دشمن سے مقابل ہو اگر غیرت ہے
باہمی جنگ میں اظہار شجاعت کیسی

شیعہ سنی جھگڑوں سے متاثر ہو کر مسلمانان لکھنؤ کو خاص طور پر خطاب کرتے ہیں ؎

کیوں غبار فتنۂ اشرار میں گم ہوگیا
ایک ہی امت کے لوگوں میں تصادم ہوگیا

دیکھ دھندلی پڑ گئی اسلام کی تابندگی
کس کے مذہب نے سکھائی ہے یہ طرز زندگی

تیغ مسلم تھی برائے حفظ ننگ جان و مال
یا برائے قتل بے جرمان بیکس خستہ حال

قومی اور سیاسی نظموں سے ان کے جذبۂ حریت اور ہندوستان دوستی کا اظہار ہوتا ہے "چلے جاؤ سائمن" اور "چرچل کو راہ راست پر آنا ہی پڑے گا" گاندھی جی جب ۱۹۳۲ء میں لندن گول میز کانفرنس میں ہندوستانی نمائندہ کی حیثیت سے گئے تو "فقیر برہنہ" کے عنوان سے انھوں نے نظم لکھی جو بیت جوش اور جذبات سے لبریز ہے ؎

در سیاست انقلابے ایں چنیں آمد پدید
یک فقیر برہنہ در پیش خاقاں می رود
آں فقیر برہنہ پا گر بپے تنظیم ادب
گفتگو با پیر زبان پادشاہاں می رود
یا ہزار خوش نوا بیتاب در فصل بہار
در تلاش بوئے گل سوئے گلستاں می رود

نظم "خواب خیال" آزادئ ہند کے احساسات سے سرشار ہے جس میں انھوں نے چرچل سے خواب میں سوال کیے اور جواب سنے ہیں ایک دو شعر ؎

گفتم کہ رخت ہندیاں گفتا بہ بر خوش کفن
گفتم کہ بخت ہندیاں گفتا شب تار آمدہ
گفتم غلامی تا بکے گفتا کہ تا حکم قضا
گفتم کہ ہند آزاد کن گفتا کہ دشوار آمدہ

ڈاکٹر اقبال کے سیاست میں داخلہ پر ایک نظم میں کہتے ہیں ؎

یکہ بجان و دل شدم دائم فدائے تو
مست نمود خلق را نائر نوائے تو!
دفتر معنی دقیق جمع کنی بہ مصرعہ
نور ہزار آفتاب منتشر از صبائے تو
مسئلہ سیاسیات سلسلہ ایست پیچ پیچ
در خور ایں نمی بود عقل گرہ کشائے تو
گوہر خویش را چرا بر سر سنگ می زنی
نیست نقد خودنگر بہتر از ایں بہائے تو
"شاخ نہال سدرہ خار و خس چمن مشو"
اصل تو از ملک بود عرش بریں است جائے تو

(باقی صفحہ ۹ کالم ۲ پر)

مراسلات

غالب کے مختلف دواوین کے متعلق تفصیلی معلومات کی ضرورت

غالب کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں۔ ہندو پاک میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی پڑھے لکھے لوگ ان کے کلام سے خاص دلچسپی لینے لگے ہیں۔ مگر ان کے کلام کی نوعیت سے عام اردو داں طبقہ تو کیا اردو ادبیات کے طالب علم بھی کما حقہٗ واقف نہیں ہیں۔ مثلاً اردو ادب کے بہت سے مبتدی ابھی تک نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ بھوپال اول، نسخۂ بھوپال ثانی اور نسخۂ شیرانی میں فرق و امتیاز نہیں کرسکتے۔ کبھی کبھی ادبی رسالوں میں کسی محقق کے مضمون میں یہ نام دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان سے کون سا دیوان مراد ہے۔ اس کا سن کتابت، خصوصیات اور وجہ تسمیہ کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک میں متداول دیوان سے کس قدر اختلاف اور تطابق پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو کوئی ایسا سہل الحصول ذریعہ بھی نہیں ملتا کہ ان سب کے متعلق تشفی بخش معلومات حاصل ہوسکیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی ماہر غالبیات ان تمام معلومات کو کتابی شکل میں یکجا جمع کردے جس سے غالب کے کلام کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوسکیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس میں یہ بتایا جائے کہ غالب نے کتنی مرتبہ اپنا کلام یکجا کیا اور کتنی مرتبہ مکمل یا منتخبہ کلام خود اپنے ہاتھوں سے لکھا؟ خود چھپوایا یا کسی کے ذریعہ سے چھپوایا، نیز اس میں اصل نسخوں کا تاریخی سفر اور ان کے موجودہ مسکن کی نشاندہی بھی کی جائے۔ غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے ان کے کلام کے مجموعوں یا اس زمانہ میں اصل سے نقل کردہ نسخوں اور ان کے بعد شائع ہونے والے کلام کے اہم ایڈیشنوں اور ان کی خصوصیات، سن اشاعت، نیز دیگر ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔

اس طرح یہ معلومات اردو ادب کے طالب علموں خصوصاً غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت کارآمد اور مفید ہوں گی۔ توقع ہے کہ غالبیات کے محققین اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

آندھرا۔ ● شیخ قادر علی

ڈائرکٹر خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام چند خطوط

(۱)

مجھے ہندی کے ذریعے اردو کی مفت تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخلہ فارم اور پاٹھیہ کرم بھیجنے کی کرپا کریں۔ میں ایک لمبے عرصے اس طرح کی سہولت کا انتظار کر رہا تھا۔ آج میں آپ کے اشتہار کو "دھرم یگ" میں دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ کرپیہ جلدی ہی داخلہ فارم اور دوسری ضروری جانکاری دینے کا کشٹ کریں۔

راجستھان۔ ● دین دیال شرما، ایم اے

(۲)

یہاں خوش قسمتی سے کچھ حضرات جن میں سبھاش انٹرمیڈیٹ کالج کے چند طلباء بھی شامل ہیں۔ ہندی زبان سے اردو سیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک دو روپیہ فیس بھی دینے کو تیار ہے براہ کرم ان کے واسطے کم از کم چھ عدد داخلہ فارم اور پراسپیکٹس بواپسی ڈاک ارسال فرمائیں، تاکہ ان کے فارم بھر دا کر فیس داخلہ کے ہمراہ ارسال خدمت کئے جاسکیں۔

اناؤ۔ ● سید الساجدین قادری

(۳)

آپ کا بھیجا "رہنما" ۱۰-۳-۷۲ کو پراپت ہوا تھا۔ اس کے پرتھم گیارہ پرشٹھوں کا ادھیین میں نے کرلیا ہے۔ ابھی تک مجھے اس میں کوئی کٹھنائی محسوس نہیں ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ میں نے لکھائی کا بھی ابھیاس کیا ہے۔ ان گیارہ پرشٹھوں کو میں لگ بھگ دس دن میں پڑھا۔ میں آگے کا بھی ادھیین کر رہا ہوں۔ آپکے پراسپیکٹس کے مطابق آپ کو پتر بھیج رہا ہوں۔

نئی دلی ● راجندر پرساد

نصر قریشی

غزل

چپ چپ ہے سارا شہر کوئی بولتا نہیں
مصلوب کے لئے کوئی لب کھولتا نہیں

ہاتھوں سے مٹ چکی ہے لکیر ستمگری نہ
قاتل مگر وہ چہرہ کبھی بھولتا نہیں

احساس کرب جلتی چٹانوں کی ساعتیں
ساکت ہیں اب سے اک کوئی کبھی پوچھتا نہیں

ہم بھی نہیں رہے وہ زمانہ بچھڑ گیا
اب تو میں اپنے آپ کو بھی ڈھونڈتا نہیں

دانشوران شہر بھی خانوں میں بٹ گئے
کوئی کسی کے قد کو کبھی ناپتا نہیں

بے چہرگی کا راز بتاتا ہے سب کو جو
ہاتھوں میں آپ کے تو وہی آئینہ نہیں

معصومیت کا آنچل لبادہ نہ اوڑھئے
کیا کوئی آپ کو یہاں پہچانتا نہیں

سورج کسی کا دھوپ میں جلنے لگا بدن
پل بھر ٹھہر کے کوئی کبھی دیکھتا نہیں

گہرا سکوت قدموں کی آہٹ بھی کھا گیا
پچھلے پہر بھی نغمۂ شب گونجتا نہیں

چیخوں میں ڈھل گئیں مرے گیتوں کی دھڑکنیں
کانوں میں میٹھا بول بھی رس گھولتا نہیں

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔ ادارہ

اخبار و اذکار

رائے بریلی کالج میں اردو تعلیم کا انقطاع

معتبر اطلاع کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ رائے بریلی کے جہاتما گاندھی انٹر کالج میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے اردو کے ایک سینئر استاد چرن سرن ناتھ کو معطل کر دیا گیا۔ یہ انٹر کالج پہلے ایک نجی تعلیمی ادارہ تھا مگر ابھی حال ہی اسے حکومت نے اپنے انتظام میں چلانے کا اعلان کیا۔ سرکاری کنٹرول تمام ہوتے ہی اردو کے لئے کالج کے دروازے بند کر دئے گئے اور کالج کے ایک لائق اور صاحب علم پروفیسر کو معطل کر دیا گیا۔

• سیاست جدید کانپور

اردو کی ہمہ گیر تعلیم پر زور

اعظم گڑھ۔ یو۔پی میں دینی تعلیمی تحریک نے اپنے کام کا یہ نقشہ مرتب کیا ہے کہ اردو اور بنیادی تہذیبی تعلیم کے لئے (۲۰) ہزار مکاتب۔ (۲۵۰) ہائی اسکول، (۱۵۰) انٹر کالج اور (۵۰) ڈگری کالج قائم ہوں۔

یہ انکشاف یہاں دینی تعلیمی کونسل کے سکریٹری مولانا محمود الحسن نے کیا جو ضلع اعظم گڑھ کے دینی تعلیمی کنونشن میں تقریر کر رہے تھے۔ یہ مولانا محمود الحسن نے کہا کہ دینی تعلیمی تحریک کا مقصد زبان، تہذیب اور مذہبی اقدار کی حفاظت کے لئے تعلیم کا ایک متوازی نظام قائم کرنا ہے جس میں وہ سب مضامین نصاب میں شامل ہوں گے جو سرکاری نصاب میں داخل ہیں۔ تعلیم کا ذریعہ اردو زبان ہوگی۔

کنونشن نے دو قراردادوں میں مرکزی وزیر قانون کی اردو دوری والی تقریر اور یو۔پی کی مجالس قانون ساز کے مشترکہ اجلاس میں گورنر کے خطبے پر احتجاج کیا جس میں اقلیتوں کے الگ تعلیمی اداروں کو ختم کرنے اور آٹھویں درجہ تک تعلیم کو قومیانے کا مقصد ظاہر کیا گیا۔

کنونشن نے ضلع کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ ضلع میں ہر جگہ اردو تعلیم کے لئے مکاتب قائم کریں تاکہ کوئی بچہ یا بچی مکاتب میں اردو کی تعلیم سے محروم نہ رہے ان مکاتب اور مدارس کا الحاق ضلع کی دینی تعلیمی کونسل سے کرایا جائے تاکہ ایک مستحکم نظام قائم ہو سکے۔

• قومی آواز، لکھنؤ

دہلی میں اردو کی درسی کتابیں مہیا کرنے کا وعدہ

دلی۔ نجف گڑھ ہائر سکنڈری اسکول میں دلی میٹروپولیٹن کونسل کے جناب میر مشتاق احمد کا استقبال کیا گیا۔ اسکول کے پرنسپل جناب زین العابدین صاحب نے میر مشتاق احمد صاحب کو سپاسنامہ پیش کیا جس میں اردو کی درسی کتابوں کے نہ ملنے کی شکایت کی گئی تھی میر صاحب نے اپنے جواب میں یقین دلایا کہ درسی کتابوں اور ایسی ہی دوسری ضرورتوں کو پورا کیا جائے گا آپ نے بچوں کو تعمیری نقطۂ نظر اختیار کرنے کی تلقین کی۔

• الجمعیۃ دہلی

خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تیسری سہ ماہی رپورٹ

داخلے

۱۔ اس سہ ماہی میں جن لوگوں نے نصاب تعلیم اور داخلہ فارم حاصل کئے۔ ۲۴۰۷

۲۔ ان مہینوں میں داخلہ حاصل کرنے والوں کی تعداد ۴۷۵

۳۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۷۷ء تک کل اراکین ۱۴۰۵

تعطیلات گرما کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ ہم نے اشتہار دیا اور یہ بات صاف کر دی کہ داخلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ اس کا اثر اچھا ہوا۔ اور توقع سے زیادہ اراکین کی تعداد بڑھی۔

دوسری کتاب حاصل کرنے والے

جیسا کہ ہم نے دوسری سہ ماہی رپورٹ میں لکھا تھا کہ دوسری منزل تک پہنچنے میں اراکین کو کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا مکمل تجزیہ ہم تیسری رپورٹ میں پیش کریں گے۔ یہ اس طرح ہے۔

۱۔ دوسری کتاب حاصل کرنے والے ۳۲۱

۲۔ راہنما گم ہو گیا ہے دوبارہ حاصل کرنے والے ۴۰

۳۔ کسی وجہ سے تعلیم رک گئی تھی اب تکمیل کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۵۵

۴۔ خطوط واپس آگئے ہیں (لاپتہ) ۳۰

۵۔ خارج ہونے والے ۳۸

ہم نے صرف دو دفعہ یاددہانی کے خطوط بھیجے ہیں۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والے رسالے اور اخبارات خواہ وہ اردو کے ہوں یا ہندی کے ہماری رپورٹ شائع کریں گے۔ تو کسی نہ کسی طرح ہماری یہ تیسری یاددہانی ان لوگوں تک پہنچ جائے گی جو تکمیل کی منزل میں ہیں۔

تیسری کتاب حاصل کرنے والے

ہماری تیسری کتاب دیر میں تیار ہوئی۔ ابھی ابھی چھپ کر آئی ہے اور دوسری منزل کی تکمیل پر اپنے ہاتھ سے ہمارے نام اردو میں خط لکھنے والوں کو بھیج دی گئی ہے۔ ان کی تعداد ۵۴ ہے۔ یہ نصاب ایک سال کا ہے۔ پہلی دفعہ ہمارا سیشن جون کے آخر میں ختم ہوتا ہے۔ امید ہے کہ اس وقت تک کافی لوگ کتاب منگا چکے ہوں گے۔ یہ ہمارے فارغ التحصیل طالب علم کہلائیں گے یعنی وہ لوگ جو ابتدائی اردو سیکھ چکے ہیں اور اردو میں عام دلچسپی کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں

اور اردو میں خط لکھ سکتے ہیں۔

ہم ہر سہ ماہی رپورٹ میں نئی قسم کے اعداد و شمار دیتے ہیں۔ پہلی دفعہ صوبوں کے لحاظ سے دوسری دفعہ پیشوں کے لحاظ سے اب تیسری دفعہ عمر کے لحاظ سے اعداد و شمار دے رہے ہیں۔

اراکین کی عمر کے اعتبار سے اعداد و شمار

۱۔ ۲۰ سال اور اس سے کم عمر کے اراکین	۲۵۴
۲۔ ۲۱ سے ۳۰ سال تک کی عمر کے اراکین	۹۰۹
۳۔ ۳۰ سال سے زیادہ عمر کے اراکین	۲۴۳
۴۔ عمر کا اندراج نہیں	۹۰
۵۔ نام خارج	۳۸
	۱۶۰۵
۱۔ خواتین کی تعداد	۱۴۶
۲۔ مرد	۱۵۵۹
میزان	۱۶۰۵

یکم رجون سنہ ۷۲ء سے انگریزی کے ذریعہ اردو سیکھنے والے بھی داخلہ حاصل کر سکیں گے۔ چونکہ انگریزی کی کتاب بڑے سائز کی اور ضخیم ہے اس لئے ڈاک خرچ کے دو روپیوں کے علاوہ اس کتاب کے تین روپے یعنی جملہ پانچ روپے لئے جائیں گے۔ ہندی کے ذریعہ سیکھنے والوں سے حسب معمول پورے کورس کے ڈاک خرچ کے صرف دو روپے لئے جائیں گے۔

دام بھیجنے کا ذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر ہے۔ منی آرڈر میں مشکل یہ ہے کہ داخلہ فارم اور منی آرڈر پہنچنے کی تاریخیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ انتظار کے بعد ہمیں ان دونوں کو منسلک کرکے کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ سہولت اس میں ہے کہ داخلہ فارم کے ساتھ پوسٹل آرڈر بھیجیں۔ اس سے کارروائی جلد ہو جاتی ہے۔

امید ہے کہ آپ اپنے حلقے میں اس کام میں دلچسپی لیں گے کہ اردو کو عام کرنے کا یہ ٹھوس طریقہ ہے۔ اخباروں اور رسالوں سے بھی یہی درخواست ہے۔ • عبدالغفار مدھولی (ڈائرکٹر)

اردو کے نادان دوستوں سے ہوشیار

نئی دہلی:- ادبی سنگم جامعہ نگر کی ایک نشست جامعہ اسٹاف کلب میں جناب پروفیسر انور علی خاں سوز صاحب کی صدارت میں ہوئی۔ اس نشست میں اردو کے نامور شاعر جناب آنند موہن زتشی گلزار دہلوی صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

گلزار صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ تحریک اردو سے میرا اور میرے خاندان کا جو گہرا تعلق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہم نے اس کو اپنے دین کی طرح عزیز رکھا ہے۔ گلزار صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ تحریک اردو کو خود اردو کے نادان دوستوں نے نقصان پہنچایا ہے اور کسی حد تک کانگریسی حکومت کے ارباب حل و عقد بھی

اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ • نامہ نگار

تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی وضاحت

نئی دہلی:- چیف منسٹر جناب پی وی نرسمہا راؤ نے نظم و نسق کے مقاصد کے لئے علاقائی زبان کو رائج کرنے کے لئے سارے ملک کے لئے ایک جامع پروگرام کی ضرورت پر زور دیا۔ راج بھاشا سمیلن کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جناب نرسمہا راؤ نے کہا کہ اگر ایسا پروگرام ترتیب نہ دیا جائے تو مختلف ریاستوں میں علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرنے والے نوجوانوں کو روزگار حاصل کرنے میں مشکلات پیش آئیں گی۔ جناب نرسمہا راؤ نے کہا کہ عوام سے حکومت کا رابطہ ان ہی کی زبان میں ہونا چاہیے تاکہ جمہوریت با معنی شکل اختیار کر سکے۔ چیف منسٹر نے ہندی اور دوسری زبانوں کو فروغ دینے کے لئے ایک کل ہند پلیٹ فارم کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ روزمرہ کے نظم و نسق میں ان زبانوں کا موثر استعمال ہو سکے۔ چیف منسٹر نے کہا کہ آندھرا پردیش میں تلگو کو سرکاری زبان بنایا گیا ہے اور یونی ورسٹی سطح پر بھی ذریعہ تعلیم ہوگی طلبہ کے سرپرست تلگو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی مخالفت کر رہے ہیں کیونکہ اس طرح کل ہند خدمات میں ان کے بچوں کے لئے مواقع محدود ہو جائیں گے۔ جناب نرسمہا راؤ نے توقع ظاہر کی کہ ہندی رابطہ کی زبان کی

حیثیت اختیار کرے گی۔ مرکزی وزیر شہری ہوا بازی ڈاکٹر کرن سنگھ نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ ہندی اور علاقائی زبان کو یقیناً مناسب مقام مل جائے گا لیکن ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی کا بھی احترام کرنا چاہیے۔

• سیاست حیدرآباد

عبدالمتین نیاز کے اعزاز میں مشاعرہ

حیدرآباد۔ بھوپال کے ممتاز شاعر جناب عبدالمتین نیاز کی حیدرآباد میں آمد پر ادارہ برگ آوارہ کے زیر اہتمام جناب سعید بن محمد نقش کی زیر صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں شہر کے ممتاز اور نامور شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

• برگ آوارہ

"تیر نیم کش" کا اجرا

حیدرآباد۔ ملک کے ممتاز مزاح نگار جناب بھارت چند کھنہ کے مزاحیہ مضامین کے تیسرے مجموعہ "تیر نیم کش" کی رسم اجرا زیر صدارت ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ زندہ دلان حیدرآباد کے اہتمام میں عمل میں آئی جس میں بھارت چند کھنہ کے فن اور شخصیت کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا گیا۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے رسم اجرا انجام دی اور ڈاکٹر کھنہ کو ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کا نمونہ بتایا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کھنہ صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ ہمارے معاشرہ کا البم ہے جس سے اس معاشرہ کو پہچانا جائے گا۔ کھنہ صاحب کے تیر نیم کش میں طنز و مزاح ظرافت حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کے سبھی قسم کے تیر ملیں گے ان کے علاوہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جناب مجتبیٰ حسین جناب نریندر لوتھر اور جناب احسن علی مرزا نے جناب کھنہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

• مجتبیٰ حسین

اردو کے مسئلہ کو سیاست سے علیحدہ رکھا جائے

پٹنہ۔ اردو رائٹرس سرکل کی غیر معمولی نشست جناب کلیم الدین احمد صاحب ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کے زیر صدارت جناب عبدالقیوم انصاری صاحب وزیر آبپاشی اور بجلی کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔

جناب عبدالقیوم انصاری صاحب نے تہنیت کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ اردو زبان و ادب سے ان کی دلیسی ہی دوستی اور جذباتی وابستگی ہے جس جذبہ کے تحت اردو رائٹرس سرکل زبان و ادب کی خدمت کر رہی ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کی ترویج و بقا اور زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کی جدوجہد کی جائے مگر یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو سیاسی گٹ بندی اور نعرہ بازی سے علیحدہ رکھا جائے انھوں نے یقین دلایا کہ اس سلسلہ میں وہ حتی المقدور اپنی وساطت سے اپنی کوشش جاری رکھیں گے کہ اس صوبے اور ملک میں اردو کو صحیح مقام ملے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں اس سلسلہ میں سنجیدگی سے اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے لئے غور و فکر کر رہی ہیں۔

• الجمعیۃ

اقتباس نگاری پر مقالہ

انجمن اتحاد المومنین بھوپال کی جانب سے ایک ادبی نشست ڈاکٹر سید فدا عباس رضوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب علی عباس امید نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس نشست میں اردو تنقید کی ایک شاخ "اقتباس نگاری" پر ڈاکٹر اخلاق اثر نے ایک مضمون پڑھا۔ حاضرین جلسہ نے اس مقالہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب علی عباس امید نے امید ظاہر کی کہ ہمارے اہل نظر حضرات جلد ہی اس صنعت کی طرف متوجہ ہوں گے اور اسے باقاعدگی کے ساتھ ادب کا ایک جزو قرار دیں گے۔

• عصمت ندیم

ضلع چتوڑ آندھرا پردیش میں اردو سیمینار

تحتانیہ مدارس کی انجمن اساتذہ ضلع چتوڑ آندھرا پردیش کی جانب سے ایک اردو سیمینار ضلعی سطح پر زیر صدارت شری اے دی ایس سوریہ نارایا مورتی ناظم تعلیمات ضلع چتوڑ چتور ٹیگنور میں منعقد ہوا۔ سیمینار میں مندرجہ ذیل امور کا مطالبہ کیا گیا۔

(۱) ضلع میں فی الحال کم از کم ایک اردو میڈیم ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

(۲) مزید اردو اپر پرائمری مدارس کھولے جائیں۔



۴۔ ایسے وسطانیہ اور فوقانیہ مدارس میں جہاں کم از کم دس طلبہ اردو بحیثیت مادری زبان یا مضمون اول پڑھنا چاہتے ہیں وہاں لازماً اور مجلت کے ساتھ اردو ٹیچر کی جائدادوں کا استحکام کیا جائے۔ ۵۔ جونیئر کالجوں میں بھی اسی قسم کا انتظام ہو۔ ۶۔ علاقائی زبان تلگو کے سکھانے کے لئے ہر اردو تحتانیہ مدرسہ میں ایک تلگو سکنڈری گریڈ استاد کا انتظام کیا جائے۔ ۷۔ اسی طرح ہر تلگو تحتانیہ مدرسہ میں جہاں کم از کم دس ایسے طلبہ ہوں جن کی مادری زبان اردو ہے ایک سکنڈری گریڈ اردو ٹیچر کا انتظام کیا جائے۔

ناظم تعلیمات نے اپنی جوابی تقریر میں اراکین جلسہ کو یقین دلایا کہ حکومت ان کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کرے گی اور اپنے احکام پر عمل درآمد کرائے گی۔ ٭ ٭ ٭

صفحہ ۱۲ سے آگے

میں نے بحث کو معنی خیز بنانے کے لئے ہندوستانی زبانوں اور ان کے پڑھنے والوں کی موجودہ صورت حال کے مسئلے کو زیر بحث لانے کی کوشش کی میرا احساس یہ تھا کہ اس طرح کے کل ہند بین لسانی سیمینار کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم اُن اہم مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں جن سے ہماری کچھ زبانیں دو چار ہیں۔ اس سیمینار کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ مختلف علاقائی زبانوں کے ادب کے سرسری جائزوں تک خود کو محدود رکھیں، یہ مسائل تو اپنی زبانوں کے اجتماعات میں اور جرائد کے صفحات پر طے کئے جا سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ ہم نے ادب کے احتجاجی کردار، ادیب کے سماجی تبدیلی کے آلۂ کار ہونے اور ہندوستانیت وغیرہ کے مسائل پر پچھلے چار دنوں میں کافی بحث کی ہے۔ لیکن میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ زبانیں جنہیں آزادی کے بعد پڑھنے والے میسر نہیں آرہے ہیں کسی تبدیلی میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں؟ یہ سوال براہ راست اردو اور اس کی طرف مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے رویے سے متعلق ہے۔ اردو کو ہمارے دستور میں تسلیم کیا گیا ہے اردو کتابوں کو دوسری زبانوں کی طرح ساہتیہ اکیڈیمی انعام بھی ملتا ہے اور اردو ادیبوں کو یوم جمہوریہ کے موقع پر اعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ یہ سب ہے لیکن عمل اتنا شروع۔ پچھلے پچیس برسوں میں اردو والوں کو اپنی زبان سیکھنے اور اس میں تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی جمہوری حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں کئی نسلوں کا فاصلہ پیدا ہو گیا ہے اردو کو نوجوان پڑھنے والے میسر نہیں جن کے ذہن اثر پذیری کی صلاحیت رکھتے اور نئی تبدیلیوں کو قبول کر کے انہیں رد عمل لانے میں آلۂ کار بن سکتے ہیں۔ ایک لحاظ سے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج اردو ادب کے قاری صرف اردو کے ادیب ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ہمارے وہ رفقاء جو اردو زبان و ادب سے واقف نہیں اس بات سے اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں کہ اردو زبان و ادب میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ اس کا رشتہ قارئین سے باقی نہیں رہا۔ میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو آج بھی ہماری سب سے زیادہ ترقی یافتہ، زندہ، اور ہر تبدیلی کو قبول کرنے والی زبانوں میں سے ایک ہے۔ وہ مشترکہ تہذیب کا بہترین ثمرہ ہے اور اس کی بہترین روایات اور معاصر تقاضوں کی ترجمان۔ لیکن ہماری حکومتوں کا رویہ اس کی طرف معاندانہ رہا ہے۔ جب تک کوئی زبان وسیلۂ معاش اور ذریعۂ تعلیم نہ بنے وہ نئی نسلوں کی زبان نہیں بن سکتی۔ اردو کو پاکستان میں سرکاری زبان بنایا گیا، جہاں اس کی جڑیں بہت کمزور تھیں۔ بنگلہ دیش میں اردو کے ساتھ جو کچھ ہوا وہی پنجاب اور سندھ میں بھی ہو سکتا ہے اور اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارے ملک میں کشمیر کو اردو کی ریاست قرار دیا گیا ہے لیکن اب کشمیری بجا طور پر اپنی زبان کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جہاں اردو کی جڑیں ہیں دلی، یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور حیدرآباد کے کچھ علاقے وہاں اردو کو اب تک ثانوی زبان کا درجہ بھی نہیں دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اسکولوں سے اردو کو خارج از نصاب کر کے اردو والوں پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس اجتماع میں موجود تمام ادیب اردو کے جمہوری حق کے لئے ہمارا ساتھ دیں کیونکہ جو سلوک ایک زبان کے ساتھ ہو رہا، وہ کسی زبان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر کچھ حضرات نے آواز بلند کی کہ یہ غیر متعلق بحث ہے، صدر نے فرمایا کہ اس وقت ہم پنجابی کے موجودہ ادب پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اس لئے اس بحث کو ختم کرنا مناسب ہوگا۔ اس بات پر میں نے احتجاج کیا، قرۃ العین حیدر نے بھی کہا کہ اردو ہمارے معاصر سماج کا لازمی جزو ہے اس پر بحث کا موقع ملنا چاہئے۔ ملک راج آنند نے تسلیم کیا کہ اردو زبان کا مسئلہ بحث سے متعلق ہے اور اسے ریکارڈ کر لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بزم ادب کے مسائل پر خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔

سردار جعفری نے افتتاحی اجلاس میں اردو ادب اور ادیبوں کا تعارف کراتے ہوئے اردو زبان کے حال اور مستقبل کی طرف معنی خیز اشارے کئے تھے۔ اور وہ بھی چاہتے تھے کہ اردو زبان کے مسئلے پر خصوصیت سے بحث ہو۔

اسی دن شام کے اجلاس میں لِشپ کے مضمون میں ایک بات یہ کہی گئی کہ عصر ادب کے سلسلے میں اس کے قارئین کی تعداد کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کو لے کر میں نے پھر اردو کے سوال پر خصوصی توجہ کا مطالبہ کیا۔ اس وقت انور عظیم نے جو مقرر کی حیثیت سے شریک تھے، میری پرزور تائید کی۔ وقفے میں خصوصیت سے کشمیری اور پنجابی ادیبوں سے میری جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی بنا پر میں امید کرتا تھا کہ ان کی طرف سے اردو کے مقدمے کی وکالت ہوگی۔ دبی زبان میں اردو کے حق کو نادم اور لِشپ نے تسلیم کیا، لیکن اس وقت کشمیری زبان کو سرکاری حیثیت دینے کے سوال کو خصوصیت سے اٹھایا گیا۔ سندھی کے ایک نمائندے نے کہا کہ سندھی کا معاملہ بھی اردو جیسا ہے۔ اس پر میتھلی اور راجستھانی کی طرف سے بھی آوازیں اٹھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو انہیں تمام زبانوں کے ساتھ اپنے جمہوری حق کے لئے متحدہ محاذ بنا سکتی ہے اور ہمیں ایسا کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کچھ لوگ اردو زبان و ادب کو بولیوں کے مساوی حق دینے ہی کی بات کریں تو مجھے ان کی نیت میں تھوڑا سا شک ضرور ہوتا ہے۔ اردو بولی نہیں، ایک ترقی یافتہ ادبی زبان ہے جو علمی زبان بھی رہ چکی ہے اور مناسب حالات میں تو علمی زبان کی حیثیت سے بہت ترقی کر سکتی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم ساہتیہ اکیڈیمی انعام جیسے جزوی مسئلے کو موجودہ ادبی صورت حال کی بحث میں غیر ضروری اہمیت اور وقت دے سکتے ہیں مگر ایک زبان یا کچھ زبانوں کی زندگی اور موت کے سوال کو غیر متعلق سوال سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نیشنل بک ٹرسٹ کا کام کتابیں چھاپنا ہے، زبانوں کے حقوق کے معاملات حکومت کی اعلیٰ اسٹیج پر پالیسی کے مسائل کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں لیکن ساہتیہ اکیڈیمی ہو یا بک ٹرسٹ، ان اداروں کے سیمیناروں میں ہم ادب کے مسائل کے ساتھ زبانوں کے مخصوص سوالات پر بھی معنی خیز گفتگو کر سکتے ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے اس سیمینار نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے اور سمجھنے کا موقع دیا۔ اس سلسلے میں یہ سیمینار کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ سا اردو والوں کی حد تک اس سیمینار کا مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اردو زبان کے مسئلے کو ایک دو تنہا آوازوں کے علاوہ، باقی تمام ارکان نے توجہ کے ساتھ سنا اور اس کے حق کو تسلیم کیا۔ ڈاکٹر کیسکر نے اپنی اختتامی تقریر میں خصوصیت سے اردو اور کشمیری زبانوں کے مسئلے کو بجا طور پر اہمیت دی۔ جس کے نتیجے میں دور افتادہ علاقوں کے وہ ادیب بھی جو اردو کے مقدمے سے بے خبر تھے، اس زبان کے مسئلے سے واقف ہو گئے۔ زبان زندہ رہے، اس کا تحفظ ہو تو ادب کی کوشش بھی معنی خیز ہو سکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

وحید اختر

میرا صفحہ

(۴)

مصنفین کے تین کیمپ کا غالب اور اہم جز پانچ روزہ سیمینار تھا۔ اس سیمینار میں ایسے مسائل بحث کے لئے رکھے گئے تھے جو تمام زبانوں کے لئے مشترکہ اہمیت و معنویت کے حامل ہیں۔

۲۸ اپریل کے دونوں اجلاسوں میں بحث کا موضوع تھا "ہندوستانی ادب میں ہندوستانیت"۔ اس موضوع پر چار مقالات پڑھے گئے گوپال ہلدار (بنگالی)، سریش دلال (گجراتی)، کیشو ملک (انگریزی)، شیودان سنگھ چوہان (ہندی)۔ گوپال ہلدار مارکسی طرز فکر کے حامل ہیں۔ لیکن انھوں نے ہندوستانیت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ ویدوں سے شروع ہو کر بھگتی تحریک اور جنگ آزادی تک پہنچا تھا۔ دوسرے مقالوں میں بھی اپنشد، ویدانت ... اور بھگتی پر ہی زیادہ زور دیا گیا۔ ایک آدھ مضمون نگار نے تصوف اور مشترکہ ہندو مسلم تہذیب کا بھی ذکر کیا۔ ایک گجراتی نقاد نے تو ہندوستانیت کا اتنا سادہ نسخہ تیار کر لیا تھا کہ جس جدید نظم یا افسانے میں رام، کرشن، سیتا، ساوتری وغیرہ کا ذکر آ جائے اسے ہندوستانی مان لیا جائے۔ ایک تامل ادیب نے بجا طور پر شکایت کی کہ ہندوستانیت کی جو تعریف کی گئی ہے وہ شمالی ہند کے آریائی کلچر کی تعریف ہے۔ دراوڑی کلچر جو زیادہ قدیم اور زیادہ ہندوستانی ہے اسے ہندوستانیت سے خارج ہی کر دیا گیا ہے۔ سردار جعفری نے ہندوستانیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میلان ہمہ گیر انسان دوستی اور آفاقیت سے کٹ کر احیا پرستی اور تہذیبی عصبیت کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ عام طور سے اس بات پر اتفاق تھا کہ ہندوستانی ادب میں ہندوستانیت کی تلاش ایسی ہی ہے جیسے ہندوستانیوں میں ہندوستانی تہذیب کے اثرات کی تلاش یعنی ایک مسلم حقیقت کو تلاش کرنے کی سعی رائیگاں۔ میرے خیال میں ہندوستانیت کو آفاقیت کے متضاد یا اس کی ضد سمجھنا، دونوں ہی میلانات ادب کو محدود کرنے کی کوششیں ہیں۔ اگر ہماری تہذیب کا کردار ترکیبی رہا ہے تو اس کی تشکیل میں جتنا حصہ وید و ویدانت اور بھگتی کا ہے اتنا ہی مسلمانوں کے طرز فکر و تصوف دین کا بھی ہے اور اسی حد تک مغربی علوم و نظریات کے اثرات بھی ہندوستانیت کا جزو مانے جا سکتے ہیں۔ موجودہ ہندوستانی طرز فکر میں مارکس اور ڈارون، رسل اور سارتر، آئن سٹائن اور دوسرے مغربی مفکرین اور سائنسداں بھی برابر کے شریک ہیں۔ ہندوستانیت سے کسی ایک عنصر کو خواہ وہ اسلامی ہو یا مغربی، دراوڑی ہو یا آریائی خارج کر کے ہم ہندوستانیت کو محدود کر دیں گے۔ یہ بھی کہا گیا کہ آزادی کے بعد اپنی بازیافت کا جو عمل شروع ہوا اس میں ہندوستانیت کا سوال بہت اہم ہے لیکن ہر ادیب سے یہ مطالبہ نہ تو تہذیب کی خدمت ہے نہ ادب کی۔ ہر ادیب جس تہذیبی ماحول میں رہتا ہے اس کے اثرات جلی یا خفی، شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی تحریروں میں جھلکتے ہی ہیں پھر خصوصی قسم کی ہندوستانیت پر اصرار کیوں؟ کہیں اس اصرار کا رشتہ جن سنگھ کے ... سے تو نہیں جا ملتا۔ اس خطرے کی آگہی ضروری ہے۔ ڈاکٹر ... اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ شام کے اجلاس کی صدارت ... نے کی۔

۲۹ اپریل کو موضوع بحث تھا "احتجاج کا ادب"۔ صدارت ... نے کی۔ ... اس موضوع پر چار مقالے پڑھے گئے پرتیش نندی (انگریزی)، ... سردار جعفری (اردو) اور ... سنہا (بنگالی)۔ سردار جعفری نے فارسی کی ... روایات کا تجزیہ کیا جن میں اپنے عہد کی ... اور تنگ نظری کے خلاف ... احتجاج کیا ہے۔ ... اردو ادب کی احتجاجی روایات کا جائزہ لیا۔ جدید اردو ادب میں احتجاج کی نوعیت اور اس کی معنویت سے انھوں نے بحث نہیں کی۔ پرتیش نندی نے جدید احتجاجی مسائل اور جدید ذہن کی ترجمانی کی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ اب ادبی تحریروں کا وقت ختم ہو چکا ہے احتجاج عمل کے میدان میں آنے کا متقاضی ہے۔ یہاں جدید ذہن کا اظہار تھا جو ادب کو سماجی سیاسی مسائل سے اتنا زیادہ جوڑ دیتا ہے کہ ادب صرف وابستگی (COMMITMENT) کا دوسرا نام بن جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ رجحان ترقی پسندوں کے ادبی تصور ہی کی نئی شکل ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ... جیسے ترقی پسند کو بھی اس خیال سے اختلاف کرنا پڑا۔ احتجاجی ادب کے سلسلے میں ایک سوال یہ اٹھا کہ ہم قدیم ادب کو احتجاج کا ادب کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ ایک میلان تو یہ تھا کہ تمام اچھا ادب احتجاجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ لیکن میرا احساس یہ تھا کہ اس طرح ہم جدید ادب کی ایک نمایاں خصوصیت کو ضرورت سے زیادہ پھیلا رہے ہیں۔ احتجاج کی معنویت اور اہمیت بیسویں صدی کے ادب میں جو ... ہے اس کی مثال آزادی سے پہلے ترقی پسند ادب اور آزادی کے بعد کے جدید ادب میں ملتی ہے۔ ان دونوں احتجاجوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ ایک احتجاج کا سرچشمہ ایک نظریے سے گہری وابستگی ہے اور دوسرا احتجاج ہر نظریے کو ضمنی حیثیت دے کر ادیب کی انفرادی آزادی اور اس کے حق اظہار کا نتیجہ ہے۔ یہ سوال بھی اٹھا کہ ہمیں وابستگی اور ناوابستگی، اجنبیت (ALIENATION) اور ... جیسی اصطلاحات کی بھی واضح تعریف کر لینی چاہئے کہ ادب میں بہت سے اختلافات اور بعض مناقشے مبہم اور غیر یقینی اصطلاحات کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔

۲۹ اپریل کو موضوع بحث تھا "ادب تبدیلی کے آلۂ کار کی حیثیت سے"۔ اس دن دونوں اجلاسوں کی صدارت ... نے کی۔ ... آلۂ کار کے لفظوں پر ہی اعتراض تھا۔ ان کا خیال ہے کہ ادیب کو آلے میں تبدیل کرنے کی خواہش اور کوشش دونوں ادب اور ادیبوں کے ساتھ زیادتی ہیں۔ اس موضوع پر چندرکانت بخشی (گجراتی)، بی بی بورکر (مراٹھی)، ... (تامل)، اور ... سنگھ ... (پنجابی) نے مقالات پڑھے۔ ایک رجحان پہلے دن کی بحث میں ابھر آیا ... کہ ادیب پچھلے سماجوں میں تبدیلی اور انقلاب کا آلۂ کار رہا ہے مگر بالواسطہ طور پر۔ پرانے زمانے میں ادیب کو پیغمبر اور مصلح کی حیثیت بھی حاصل تھی آج وہ حیثیت نہیں رہی۔ ایک تو ادب و فنون لطیفہ کی تہذیب سائنسی تہذیب کے سامنے بے وقعت ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ادیب اور فنکار کی وہ قدر و منزلت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ دوسرے سنجیدہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے ... زبانوں میں ... پڑھنے والے ... نہیں ہیں۔ ادب تبدیلی کے عمل پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ادیب ذہنوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہے اس تبدیلی کا مجموعی اثر سماجی تبدیلی کے عمل اور اس کی سمت پر پڑتا ہے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ تبدیلی کی سمت کیا ہو؟ کچھ ادیب قدیم کی طرف واپسی کے بھی مبلغ ہیں ... کیا یہ تبدیلی مستحسن ہوگی؟ ایک اور سوال یہ بھی سامنے آیا کہ ہم ادب کی احتجاجی نوعیت یا تغیر آفرینی کی صلاحیت کو کس حد تک قدر مانتے ہیں؟ ادبی یا غیر ادبی؟ ادب کو کسی مقصد، نظریے، اصلاح، اخلاق یا مذہب کا آلۂ کار سمجھنا ادب کے اس غلط تصور پر مبنی ہے جو ادب کو ... سمجھتا ہے ... اس کی ... جمالیاتی قدروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ۳۰ اپریل کے آخری دو اجلاسوں میں ہندوستانی ادب اور معاصر صورت حال پر بحث ہوئی۔ ان اجلاسوں کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ ... ڈاکٹر ... سنگھ (پنجابی)، شیو شنکر پلائی (ملیالم)، ... ڈاکٹر ... نے اس موضوع پر مضامین پڑھے۔ بیشتر مضامین میں علاقائی ادب پر اتنا زور تھا کہ عام دلچسپی اور اہمیت کے مسائل زیر بحث ہی نہیں آ سکے۔ دوسرے اجلاسوں میں بھی یہ رجحان سامنے آتا رہا تھا جس کی وجہ سے مشترکہ معنویت کے مسائل پر خاطر خواہ بحث نہیں ہو سکی تھی۔ اس عدم توجہی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ... زبانوں اور ان کے ادب پر تو بحث ہوئی مگر اردو ادب اور اس کی موجودہ صورت حال کسی ایسے مضمون کی عدم شمولیت کی وجہ سے زیر بحث ہی نہ آ سکی۔ ... کے مضمون پر پنجابی ادب و شعر کے مسئلے پر دلچسپ سوالات اٹھائے گئے جو عام طور سے ہمارے شعرا اور ادیب اٹھاتے ہیں کہ فلاں کا ذکر کیوں نہیں ہے فلاں کا نام کیوں ہے اور فلاں کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام کیوں ملا اور کسی ... اتفاق سے ساہتیہ اکیڈمی انعام کا سلسلہ ... ڈاکٹر ملک راج آنند نے ...

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) سے شائع کیا